3 1198 03409 6128
N/1198/03409/6128X

تیسرا سالانہ

کل پاک و ہند مشاعرہ

بیاد

جوش ملیح آبادی

بزم ثقافت

ایلائیڈس کالج ۱۲۶/ایف بلاک ایف نارتھ ناظم آباد کراچی

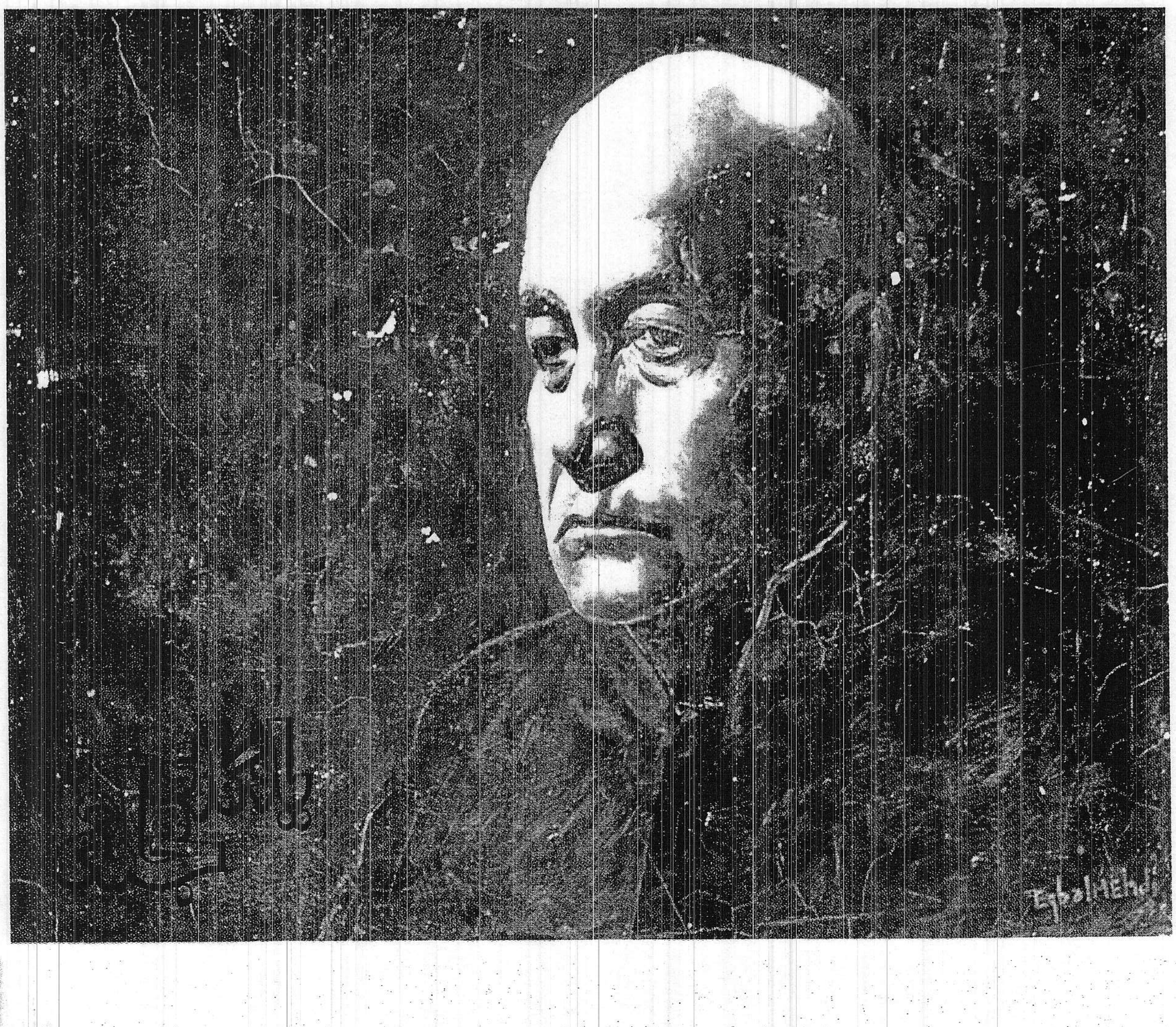

University of Pennsylvania Library
Circulation Department
Please return this book as soon as you have finished with it. In order to avoid a fine it must be returned by the latest date stamped below.

FACULTY
APR 2 2 2009

W

(Form L-9) M-719

91-930809
P-U

Tīsrā sālānah kul Pāk o Hind mushāʻirah :
biyād-i Josh Malīḥābādī. -- Karācī : Bazm-i
S̲aqāfat, Ailīṭs Kālij, [1991]
1 v. : ill., facsims., ports. ; 28 cm.
In Urdu.
Cover title.
Rs100.00
(Commemorative volume on Josh Malīḥābādī, 1896-, an eminent poet from South Asia, issued on the occasion of 3rd annual gathering of poets from India and Pakistan; sponsored by Elite's College, Karachi, 1991)

AACR 2 13Ag91 P 01 11 05/06 WK14

016801 Code P-UR-91-930809
UNIVERSITY OF PENNSYLVANIA LIB.

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو ؟
"دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"

"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا"
"بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا"

"باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں"
"آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"

"ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر"
"تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے ؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی ؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی ؟

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے ؟
کمپنی کا پھر وہ دَورِ مجرمانہ یاد ہے ؟

لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج ؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے ؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے ؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے ؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے ؟

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے ؟

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں ؟
اب بھی جس کی خاک سے اُٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا ؟
آج ہی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی ؟
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی ؟

پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے ؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے !

وہ بھگت سنگھ اب بھی جسکے غم میں دل ناشاد ہے
اُس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے

اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے ؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا

آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں ؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں ؟

اہلِ قوتِ دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بیکنی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں

آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں ؟

کیا کہا "انصاف ہے انساں کا فرضِ اوّلیں"
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا نہ کردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟

آج کل تو ہر منظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟

سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے

ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوش ملیح آبادی ۱۹۳۹ء

میرا مرثیہ

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے ہنسایا جب تو روتے کو ہنسایا
ارے اس عالمِ تعجیل خو نے یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا
جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا
مجھے گونگوں کی محفل میں جگہ دی مجھے سوتوں کے حجرے میں جگایا
مجھے دیوؤں کے جنگل میں اُتارا مجھے بھوتوں کے کنڈل میں بسایا
مجھے بونوں کے پہلو میں جگہ دی مجھے مُردوں کی ارتھی پر بٹھایا
مجھے اوہام کی بھٹّی میں جھونکا مجھے اقوال کی لَو پر جلایا
مجھے اندھوں کی محفل میں سنوارا مجھے بہروں کے حلقے میں بجایا
جہاں فکرِ جواں اُگتی نہیں ہے مرا اُس خاک پر پودا اُگایا
ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے بگڑ کر کُفر کا فتویٰ لگایا
کمر میرے تجسّس کی جُھکا دی گلا میرے تفکّر کا دبایا
مرے افکار پر کی سنگ باری اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا
مرے اشعار جھنڈے پر چڑھائے مرے افکار کو "نکّو" بنایا
بہ زعمِ خویش نافہموں نے اکثر مری تذلیل کی مجھ کو جُھکایا
ہر اک سقراط آنکھیں بند کر کے مری نادانیوں پر مُسکرایا

اکٹھا ہو گئے جب جند بقراط / اشاروں سے مجھے گھامڑ بتایا
مَیں تھا بھی شاید اِک ایسا معمّہ / کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
ستا سکتی نہیں اتنا اجل بھی / مجھے اِس عمر نے جتنا ستایا
اُٹھائی خود ہی مَیں نے لاش اپنی / ارے اتنا مجھے اتنا جِلایا
انہیں بخشی وہ خوئے جاں نوازی / کہ عہدِ شوق میں مرنے نہ پایا
بنا عشق ایک رسمِ وضع داری / زمانِ شوق کو اتنا بڑھایا
پڑیں وہ وقت کی ضربیں مسلسل / کہ عِشق اپنے لہو میں خود نہایا
بجھا کر مشعلِ رُخسارِ جاناں / مِرے احساس میں لُو کا لگایا
لب و رُخسار پر کی برف باری / اور اتنی اِک شرر بچنے نہ پایا
رُخِ شاداب کی صبحِ طرب پر / غم آگیں جھٹ پٹے کا رنگ چھایا
جو طاق خال و خد میں جل رہے تھے / تہہ جلد ان چراغوں کو بجھایا
شبِ آخر کی ڈھلتی چاندنی نے / مرتب سطحِ دریا کو ہلایا
دریغا دھاریوں کو چور کر کے / گلابی پنکھڑی کو کھُردرایا
سُبک لچکے کی ڈوری توڑ ڈالی / سجل مکھڑے کے خیمے کو گرایا
قیامت ہے کہ پائے تیرگی پر / مِرے ماہ مبیں نے سر جھکایا
جہاں جلتے تھے پر وقتِ رواں کے / وہاں طوفانِ ماہ و سال آیا
مِرے اشعار مرکز سے ہٹائے / مِرے نغموں کو پردیسی بنایا
مِری نظروں کے کنگن توڑ ڈالے / مِری تخئیل کا زیور بڑھایا

جو تھی برکھا کی راتوں کا نشیمن
مجھے اس زلف میں تڑکا دکھایا

گلے پر حصر ہے جن کے سخن کا
مجھے پیہم کلام ان کا سنایا

ارے نادان نقادوں کے ہاتھوں
مری نظموں کو سولی پر چڑھایا

انہیں میرا بنایا دشمنِ جاں
جنہیں میں نے کلیجے سے لگایا

مجھے قصرِ سلاطین میں بٹھا کر
مری خود داریوں کا منہ چڑھایا

مری حالت پہ طاری کی گدائی
مری فطرت کو شاہانہ بنایا

مری ہر شام کو تسکین دے کر
مری ہر صبح کو در در پھرایا

جو تھا مجھ میں غرورِ کبریائی
بحد بندگی اس کو گرایا

مورّخ تھے جو میری زندگی کے
انہیں چن چن کے دنیا سے اٹھایا

مرے گلزار میں کانٹے اُگائے
مرے شعلوں کو خاکستر بنایا

لگا کر آگ میرے خال و خد کو
اور اس کے بعد آئینہ دکھایا

بتوں نے پھیر لیں مجھ سے نگاہیں
زمانے نے مجھے یہ دن دکھایا

یہاں المختصر ابرِ مسرّت
جو چھایا بھی تو کچھ اس طرح چھایا

دہکتی خاک پر جس طرح پل بھر
کسی اُڑتے ہوئے طائر کا سایا

نفس کی آمد و شد اللہ اللہ
مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

جوشؔ ملیح آبادی